میر گل خان نصیرؔ کی اُردو شاعری، فنی عظمت

Mir Gul Khan Naseers' Urdu Poetry: Unveiling hid Poetic Brilliance

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2024.08032242

طارق عزیز
Tariq Aziz
PhD Scholar, Department of Urdu
Islamia University, Bahawalpur

ثقلین احمد خاں
Saqlain Ahmad Khan
Lecturer, Department of Urdu
Islamia University, Bahawalpur

Abstract:

The Balochistan region is home to speakers and understanders of numerous languages. The inhabitants of Balochistan are not fully conversant in Urdu, even in this day and age of print and electronic media. About 80 years ago, Mir Gul Khan Naseer brought the scent of Urdu language to the people living in this desolate region. In the color of Urdu poetry, Balochistan was rather a boring tone before him. He may not be a native speaker, yet his poetry in Urdu has a unique fluidity and elegance. His works accurately capture the circumstances and happenings around him. His use of similes and details writing has elevated his poetry's elegance. He has a whole system of tips and tricks and a jingle of Hindi words can also be heard in his expression.

Keywords:

Mir Gul Khan Naseer, language and expression, Elegance/smoothness and fluency, Metaphors, Allusions, Imagery, Urdu poetry in Balochistan, Hindi word, Locality

میر گل خان نصیرؔ کی شاعری کی ابتدا اُردو شاعری سے ہے۔ زمانہ طالب علمی میں جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور گئے تو وہاں انھوں نے اُردو اور فارسی زبان میں طبع آزمائی کیں۔ انھوں نے بلاشبہ بلوچی شاعری میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا لیکن ان کی شاعری کے ابتدائی ادوار اُردو شاعری سے مزین ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر شاہ محمد مری لکھتے ہیں:

"میر گل خان نصیرؔ بلوچی زبان کے ملک الشعرا تو ہیں ہی، انھوں نے اُردو اور فارسی میں بھی

اچھی اور خوب صورت شاعری کی ہے۔ بلوچی شاعری تو انھوں نے بہت بعد میں شروع کیا تھا۔ ابتداء تو اُردو سے ہوئی تھی۔ اور نھوں نے یہ کام ۱۹۳۰ء کی دہائی کے اوائل سے شروع کیا تھا۔"(۱)

لاہور کی فضا میں رہ کر جب میر گل خان نصیرؔ نے سیاسی شعور میں بالیدگی حاصل کی تو انھوں نے اپنے خیالات کو نظم کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۳۳ء میں جب نواب یوسف علی خان مگسی، میر عبدالعزیز کرد اور خان عبدالصمد خان اچکزئی کی رہنمائی میں انگریز حکومت کے خلاف علانیہ بغاوت شروع ہوئی تو اس نوجوان نے اپنا پہلا شعر لکھ ڈالا۔ یہ شعر "بلوچستان جدید" میں بھی شائع ہوا جو کہ اس طرح ہے:

آگیا وقت امتحانِ بلوچ
اب ہے کچھ اور آسمانِ بلوچ

گل خان نصیرؔ ایک عرصے تک اُردو زبان میں ہی شاعری کرتے رہے اور پھر وہ بلوچی کی طرف مائل ہو گئے۔ انھوں نے بلوچی زبان میں جب شاعری شروع کی تو اُردو شاعری کی طرف توجہ نہیں دے سکے۔ اس ادبی سفر میں اس تبدیلی کے مختلف وجوہات ملتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل اکثر بلوچ شعرا اُردو زبان میں ہی شاعری کرتے تھے۔ ان میں میر یوسف عزیز مگسی، میر محمد حُسین عنقا وغیرہ شامل تھے۔ میر گل خان نصیرؔ علامہ اقبال کی قومی اور سیاسی شاعری سے زیادہ متاثر تھے اور ان کے رنگ میں ہی شاعری کرنا چاہتے تھے لیکن اپنی قومی زبان کی محبت اور قدیم شاعری کے مطالعے نے انھیں بلوچی زبان میں شاعری کرنے کی تحریک دیں۔

میر گل خان نصیرؔ کو وطن سے محبت تھی اور وہ بلوچ قوم اور بلوچی زبان سے بھی عقیدت رکھتے تھے، اسی عقیدت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنی مادری زبان میں شعر کہے۔ مادری زبان میں شعر کہنے کا شوق اس وقت اور زیادہ ہوتا جب اسے لوگ اس بات کا طعنہ دیتے تھے کہ وہ بلوچ قوم کا نمائندہ ہونے کے باوجود بلوچی میں شعر نہیں کہتا۔ بلوچی زبان کو اختیار کرنے کی ایک بڑی وجہ ۱۹۴۲ء کے چارسدہ کانفرنس کا واقعہ بھی ہے۔ جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

"ایک مرتبہ ہمیں خدائی خدمت گاروں اور باچاخان نے اپنی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے صوبہ سرحد میں چارسدہ بلایا تھا۔ میں اور میرے ساتھی وہاں گئے وہاں تقریباً کانفرنس کی پوری کاروائی پشتو میں ہوئی۔ اگرچہ میں پشتو سے زیادہ بلد نہیں تھا تاہم میں ان کے اس عمل سے زیادہ متاثر ہوا یہاں تک کے تمام نظمیں بھی پشتو میں پڑھ کر سنائی گئیں پھر مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں بھی شاعر ہوں اپنا کلام سناؤں۔ میں نے عذر کیا کہ میں اس وقت تیار نہیں ہوں اگلی نشست کے دوران سناؤں گا میرا یہ عذر مان لیا گیا۔ چناں چہ

کانفرنس کی اس نشست کے بعد میں نے دریا کا رُخ کیا۔ میں نے سوچا اب جس طرح بھی ہو مجھے اپنی زبان میں شاعری کرنی ہے اور اپنی زبان ہی میں کانفرنس میں اپنی شاعری سناؤں گا۔ چنانچہ دریا کے کنارے میں نے ایک طویل بلوچی نظم 'بیا اے بلوچ' (آ اے بلوچ) تخلیق کی اور کانفرنس کی اگلی نشست میں بہت جوش اور جذبے سے سنائی اس طرح میں نے بلوچی شاعری کی ابتدا کی۔"(۲)

بلوچی شاعری اختیار کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ میر گل خان نصیرؔ کے سامنے ایک مقصد تھا اور وہ مقصد قوم کی اصلاح اور فلاح کا تھا۔ وہ جس قوم سے مخاطب تھے، جن لوگوں کو بیدار کرنا چاہتے تھے ان کی اکثریت اُردو زبان سے ناواقف تھیں۔ اس لیے میر گل خان نصیرؔ کو اُردو شاعری بجائے بلوچی شاعری پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت پیش آئی۔

میر گل خان نصیرؔ کی اُردو شاعری مختلف اخباروں میں بھی چھپتی رہی۔ لیکن کبھی شعری مجموعے کی شکل اختیار نہیں کی اور نہ ہی میر گل خان نصیرؔ نے شاید اس کو کتابی شکل میں لانے کا سوچا۔ ان کا کلام جو ان کی بیٹی گوہر ملک کے پاس محفوظ تھا، ان کی وفات کے کافی عرصہ بعد زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ کلام 'کارواں کے ساتھ' کے نام سے ڈاکٹر شاہ محمد مری نے مہر در پبلی کیشنز کوئٹہ سے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۵ء میں ۵۰۰ کی تعداد میں میر گل خان نصیرؔ چیئر، جامعہ بلوچستان کے تحت شائع ہوا۔

"کارواں کے ساتھ" کے پہلے ایڈیشن میں انتالیس (۳۹) تخلیقات، پانچ بلوچی نظموں کے تراجم اور دس فارسی نظمیں شامل تھیں۔ ہر نظم کے نیچے تاریخ تخلیق بھی درج ہے۔ آغا ناصر نے اپنی کتاب 'بلوچستان میں اُردو شاعری' میں میر گل خان نصیرؔ کی کل تخلیقات کی تعداد ۴۷ درج کی ہے۔(۳) ("اٹھ کے اب دنیا میں جینے کا ساماں کیجئے"، "غیروں سے شکایت یہ میرا کام نہیں ہے ثاور"، "اٹھ اے بلوچی بہ اندازِ دل آرائی")۔ عابد میر نے اپنی کتاب "نصیر خوش کلام" میں انٹرنیٹ پر ان کی مزید دو نظموں کا حوالہ دیا(۴) یہ پانچ تخلیقات "کارواں کے ساتھ" کے دوسرے ایڈیشن کا حصہ بنیں۔ اب تک ان کا مطبوعہ کلام جو ان کے اُردو مجموعے میں بھی شامل ہیں وہ کل ۴۴ تخلیقات پر مشتمل ہے۔

لال بخش رند کے بقول میر گل خان نصیرؔ نے ایک نظم "پاکستان کے معنی پنجابی راج" کے عنوان سے لکھی تھی۔ ان کے بقول یہ تخلیق جولائی ۱۹۴۷ء کی ہے۔ لال بخش رند اس نظم میں پیش کردہ میر گل خان نصیرؔ کے نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پاکستان کے قیام سے برصغیر کی ساری مسلمان آبادی کو فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اسلام کے نام پر پنجاب کے کچھ لوگ ایک علیحدہ ملک قائم کرنا چاہتے ہیں چوں کہ

پاکستان میں سب سے بڑا اور قومی صوبہ پنجاب ہو گا۔ لا محالہ وہی صوبوں پر راج کرے گا
اور چھوٹے صوبے ہمیشہ اس کے مطیع رہیں گے۔"(۵)

اس نظم کے متعلق "کارواں کے ساتھ" کے اندر کوئی شواہد نہیں ملتے اور نہ ہی گل خان نصیرؔ کی شاعری پر کام کرنے والوں کی اکثریت نے اس بارے میں کچھ کہا ہیں۔ بلوچستان کو اگر کسی نے اُردو شاعری سے اور اُردو شاعری کو بلوچستان سے صحیح معنوں میں متعارف کرایا تو وہ میر گل خان نصیرؔ ہی تھے۔ میر گل خان نصیرؔ وہ شاعر ہے کہ جس نے اُردو شاعری کے رنگوں میں بلوچستان کے رنگ شامل کیے۔ انھوں نے نہ صرف بلوچستان کی مٹی خوشبو، ثقافت، تاریخ اور ادب سے اُردو شاعری کو آشنا کیا بلکہ بلوچی لہجے، کو بھی اُردو زبان میں استعمال کیا۔ میر گل خان نصیرؔ کا اسلوب ان کا اپنا ہے اور منفرد ہے۔ ان کا کلام خود نشاندہی کرتا ہے کہ یہ تخلیق میر گل خان نصیرؔ کی ہے۔ انھوں نے ادب کے لیے نظریے جس کا تعین عظمت کی بلندیوں کی طرف لے جا رہے تھے اور خطے میں ان کا کوئی ہم پلہ ملنا مشکل تھا ایسے وقت میں بلوچستان کے چٹیل پہاڑوں میں بیٹھ کر اُردو شاعری کے دامن کو وسیع کرنے کی کوشش کرنا صرف میر گل خان نصیرؔ کی ہی کاوش ہے۔

میر گل خان نصیرؔ نے شاعری کے لیے جس طرح سے زبان کا استعمال کیا ہے وہ فنی حوالے سے قابلِ داد ہے۔ انھوں نے شاعری کی زبان کو عوام کے لیے دلکش بنا کر پیش کیا اور اس میں ایسی رنگینی پیدا کی کہ ان کا کم لکھا پڑا قاری بھی اس سے محظوظ ہونے لگا اور ان کے مقصد کو سمجھتا گیا۔ ان کی زبان میں روانی و سلاست کی خوبی ہے۔ ان کے ہاں بے ساختگی کا وصف ہے۔ وہ بناوٹ اور تصنع سے پاک کلام کے خالق ہیں۔ ان کا نظریہ فن بڑا واضح تھا اس لیے وہ عوام کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عوام کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے جدید تصورات و خیالات کو عوام کے عام فہم زبان میں بیان کیا۔ مضمون آفرینی ہو یا معاملہ بندی ہر مرحلے میں انھوں نے خود کو ایک اعلیٰ تخلیق کار ثابت کیا۔ انھوں نے شاعری کا مواد ڈھونڈنے کے لیے زیادہ دور جانے کی کوشش نہیں کیں اور نہ ہی کسی دوسرے کے زورِ بازو پر پہلوان بننے کا سوچا بلکہ اس سب کے برعکس انھوں نے اپنا مواد روزمرہ کے معمولات اور عوام کی زندگی سے اخذ کیے۔ ان کے کلام میں سطحیت کے شواہد نہیں ملتے۔ میر گل خان نصیرؔ نے جس چیز کو محسوس کیا، اس کو الفاظ کا لبادہ پہنانے کے بجائے اسے اس کی حقیقت کے ساتھ پیش کیا۔ وہ الفاظ کے تخلیقی استعمال پر زور دیتے ہیں۔ لفظوں کے شعری استعمال سے تاثر پیدا کرنا زبان پر اور فن شاعری پر ان کی گرفت کا ثبوت ہے۔ الفاظ شناسی پر ان کو قدرت حاصل تھی اس لیے وہ ہندی کے غیر مانوس الفاظ کو بھی اس طرح سے مصرعے میں جگہ دیتے ہیں کہ ان کا یہ استعمال فطری محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہندی الفاظ کے اس تخلیقی استعمال میں میر گل خان نصیرؔ سرخرو نظر آتے ہیں۔

میر گل خان نصیرؔ کے ہاں ایک سچے تخلیق کار کے اوصافِ حمیدہ بھی ملتے ہیں۔ ان کی نگاہ باریک بین ہے اور قطرے میں دریا دیکھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ مشاہدے کی زبردست قوت کی وجہ سے ان کے ہاں زندگی کی داخلی

پہلوؤں سے پردہ اٹھتا نظر آتا ہے۔ وہ جس طرح سے علامات کا استعمال کرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مشاہدہ گہرا ہے۔ علامتوں کے استعمال میں بھی ایک خاص فنکاری ہے اور یہ فنکاری ان کے تجربات کی مرہونِ منت ہے۔ منظر کشی کرتے وقت وہ منظر کے جزئیات کو ایک ساتھ مختصر ابیان کرنے کے باوجود وہ منظر کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو اس منظر کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ منظر کے اندر اگر کردار کشی بھی مقصود ہو تو اس کام کو وہ بڑے شوق اور احتیاط سے کرتے ہیں۔ ان کی شاعری زورِ بیان کا نمونہ ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا ایک مکمل نظام ان کے کلام میں موجود ہیں۔ ان کے تشبیہات اور استعارات اس طرح سے ہیں کہ ان سے پہلے کسی اور شاعر کے ہاں استعمال نہیں ہوئے اور اگر ہوئے بھی ہوں تو ان کی یہ صورت نہیں ملتی۔ وہ جن تراکیب کا استعمال کرتے ہیں ان کا تعلق ان کی اپنی مٹی سے ہے۔ انھوں نے مرکبات کا وسیع پیمانے پر استعمال کیا ہے۔

سادگی وروانی:

زبان جس قدر پیچیدہ ہو گی اس قدر خیال کی ترسیل مشکل ہو گی۔ میر گل خان نصیرؔ جانتے تھے کہ ان کے سماج میں ابھی تو کسان ہل سے آگے کچھ سمجھنے کے قابل نہیں، مزدور کو اس کے اوزار کے علاوہ کسی چیز سے واسطہ نہیں پڑا ہے، نچلے طبقے کا پسینہ ہمیشہ اُمراء کی عیاشیوں کی خاطر بہتا رہا ہے، اگر ان لوگوں کے سامنے عالمانہ طرزِ گفتار اپنایا جائے یا ان کے سامنے وہ کلام پیش کیا جائے جس سے ان کو اکتاہٹ ہو جائے تو یہ ان کے مقصد اور فن دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس لیے میر گل خان نصیرؔ نے وہ لہجہ اپنایا جو بلکل سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ ""راج کرے سردار، بلوچ کا گیت، اٹھ اے بلوچ نوجوان" وغیرہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جو ان کی روانیِ کلام کی دلالت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ خوبی میر گل خان نصیرؔ کے بلوچستان کے ہمعصروں کے ہاں بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں روانی اپنی مثال آپ ہے۔ جسے پڑھتے ہوئے قاری کی زبان کبھی بوجھل نہیں ہوتی:

سپیدہ دم ہوا عیاں
بڑھا چلا وہ کارواں
یہ کہہ رہا ہے ساربان
نہیں یہ خواب کا سماں
تو کارواں کے ساتھ چل

(اٹھ اے بلوچ نوجوان)

لک بلک کر بچے روئیں
بھوکے پیٹ سجنوا سوئیں

سجنی گھر کی لاج ڈبوئیں
توند بھرے زردار۔۔۔رے بھیا
راج کرے سردار

(نظم: راج کرے سردار)

او راہ بھٹک کر جانے والے
گیت انوکھے گانے والے
بات ہماری سن کر جاؤ
آؤ، آؤ۔۔۔۔۔۔ آؤ، آؤ

(نظم: بلوچ کا گیت)

میر گل خان نصیر کے کلام میں روانی اور سادگی کی وجہ سے ایک لذت سی پیدا ہو گئی ہے۔ پڑھنے والا زبان پر اس کلام کی شیرینی کو محسوس کر سکتا ہے۔ رواں پانی کی مانند ان کا کلام جاری رہتا ہے۔ اس کے راستے میں کسی بھی مشکل لفظ یا اصطلاح جیسی رکاوٹ نہیں ہے جو اس رواں پانی کی مانند کلام کو شور پیدا کرنے پر مجبور کرے۔ علمِ بیاں کے اندر کچھ بحریں ایسی بھی ہوتیں ہیں جن کے اندر رواں کلام لکھنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن میر گل خان نصیرؔ نے ان بحور کے علاوہ دوسرے مشکل بحروں میں بھی اپنی فنکاری کا ثبوت دیتے ہوئے بہت ہی رواں شاعری تخلیق کی ہیں:

تیری مٹی میں ملا ہے میرے اجداد کا خون
نوجوانوں کا لہو طالعِ برباد کا خون
نرگسی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے رنگین آنسو
اور ناکام محبت دلِ ناشاد کا خون

(نظم: اے میرے پیارے وطن تجھ کو میں چھوڑوں کیسے)

گھبراؤ نہیں، پچھتاؤ نہیں، چلتا ہی رہے گا دور یونہی
مٹتے ہی رہیں گے نقش یونہی، بدلا ہی کریں گے طور یونہی

(نظم: گھبراؤ نہیں)

منظر کشی:

میر گل خان نصیرؔ سادہ الفاظ میں بات شروع کرتے ہیں اور بلوچی "دستانغ" کے طرز پر انھیں آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے ہاں شروع میں ایک منظر ہوتا ہے اور اس منظر کے بیان کے بعد ہی وہ بات کو آگے لے جاتے ہیں۔ پہلے وہ ایک سماں باندھتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کو پتہ چلے کہ وہ کن حالات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس منظر نگاری کے دوران ان کی نگاہ باریک بین ہوتی ہے۔ وہ مشاہدے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ منظر کے تمام جزئیات نہ بھی دیں تب بھی کمال فنکاری سے ان پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں جس میں تمام تر جزئیات خود بخود ذہن میں سمٹ کر آتے ہیں۔ ان کی منظر نگاری کا کمال یہ ہے کہ قاری پڑھتے وقت گویا منظر کو متحرک انداز میں دیکھ رہا ہوتا ہے اور خود کو اس منظر کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ اس منظر نگاری کے دوران وہ صرف حالات کا جائزہ ہی نہیں لیتے بلکہ دکھی انسانوں کے چہروں کے خدوخال اور ان کے درد کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسانی زندگی پر حالات کی سختی واضح طور پر عیاں ہوتی ہے۔ ان کی یہ تصویریں زندگی کی حقیقی صورت کو پیش کرتے ہیں اور ان کے اندر سچائی کا عنصر بھی شامل ہیں۔ منظر نگاری کے وقت انھوں نے، منظر کو جس طرح سے پایا اسی طرح سے انھوں نے دیانت کے ساتھ قرطاس پر اتارا۔ نظم 'بولان' اور 'میرا دیس پیارا" میں انھوں نے مناظرِ فطرت کو بہت دلکش انداز میں بیان کیا ہے اس کے علاوہ کلام میں اور بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ چند دیگر مثالیں ملاحظہ ہوں:

خشک و چٹیل دشتِ ناپیدا کنار
اور اس میں جھونپڑیوں کی قطار
کڑکڑاتی دھوپ تپتا ریگ زار
ہر طرف چھایا ہوا گرد و غبار
چند جانیں نیم عریاں بے قرار
صاحبانِ جاہ و دولت کے شکار
سر چھپائے جھگیوں میں اشکبار
موت کی کرتے ہیں اپنی انتظار

(نظم: تصویرِ زیست)

صبح کا وقت ہے، میری کے گرداگرد فوجیں ہیں
بلوچی خان کو گھیرے ہوئے بے تاب موجیں ہیں
شہیدِ قوم محراب خان ہیں محصور قلعے میں

رسد کی فکر ہے، بیٹھے ہیں اب مجبور قلعے میں
کھڑے ہیں دست بستہ دم بخود میر و وزیر سارے
جھکائے سر کو بیٹھے ہیں افیسر خوف کے مارے
سنبھالے تیغ جوہر دار کو محراب بیٹھے ہیں
وطن پر سر کٹانے کے لیے بے تاب بیٹھے ہیں
محل تھا سنگ و آہن کا اور اونچا تھا حصار اس کا
سنا تھا نام، ہندو سندھ نے اور قندھار نے اس کا
مشہد و کابل و غزنی کا سرسبز ملگزار اس کا
اور برما، ہندو چین و شام و روم و زنجبار اس کا
غرض ہوتا تھا شاہانِ جہاناں میں شمار اس کا
لڑائی میں نہ تھا ثانی کوئی جنگی سوار اس کا

(نظم:شہادت محراب خان)

میر گل خان نصیرؔ کا اسلوب ان کے اپنے مزاج کے مطابق ہے۔ ان کی زبان رواں ہے۔ سادہ اور سلیس پیرائے میں بات کرتے ہیں جو ان کے قاری کے علمی بساط کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پیشِ نظر ایک مقصد ہے اور وہ اس مقصد کو مقدم سمجھتے ہیں اس لیے مقصد کی تبلیغ کے لیے فن کو بہتر سے بہتر انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ وہ فن کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی شاعری کی زبان وہ ہے جو اس وقت کے سماج میں رائج تھی۔ ان کی زبان میں کئی ارتقائی مراحل بھی ہیں جو ان کے سماج کے ارتقاء کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں مانوسیت ہے۔ مقامی لہجے کی بو باس بھی ہے۔ وہ اپنی مٹی سے جڑے ہوئے ہیں۔ نظم 'شہادت میر محراب خان غازی' کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

صبح کا وقت ہے میری کے گردا گرد فوجیں ہیں
بلوچی خان کو گھیرے ہوئے بے تاب موجیں ہیں

میر گل خان نصیرؔ کے ہاں بلوچستان کی تہذیب ہے۔ کلام میں بلوچی ثقافت کی رنگینی ہے، لذت کلام میں بلوچستان کی آب و ہوا شامل ہیں۔ اپنی زمین سے جڑے رہتے ہوئے انھوں اس خطے کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہیں۔ وطن سے محبت اور وطن کے باسیوں کا پیار انھیں اجازت ہی نہیں دیتا کہ وہ اپنی مٹی سے دور ہو۔ جذبات و خیالات کی ترسیل کے

لیے مقامی الفاظ اور لہجے سے فائدہ اٹھا کر تفہیم کا کام لیتے ہیں۔ ان کے بارے میں عابد میر لکھتے ہیں:

"گل خان کی شاعری میں بھی اس خطے کا لمس و لہجہ، خوشبو و انفرادیت نمایاں نظر آتے ہیں، جس میں یہاں کی زمین کے نمک، پانی و ہوا، ثقافتی تمدنی سرمائے، مذہبی اثاثے، نظریہ حیات اور خون کی حدت و خنکی، سب نے حصہ لیا ہے۔۔۔اور پھر پور حصہ لیا ہے۔"(۵)

مقامیت کے سحر میں کھو کر میر گل خان نصیرؔ نے آفاقیت کو فراموش نہیں کیا ہیں۔ ان کے کلام میں آفاقیت ہے، اس کی جڑیں اگرچہ بلوچستان کی سرزمین میں پیوست ہیں لیکن ان کی شاخیں پوری دنیا پر چھاؤں کر رہی ہیں۔ انھوں نے عالمی سطح پر ہونے والے ظلم کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ ان کے ہاں دیگر ممالک میں ہونے والے ظلم پر احتجاج ہے۔ بلوچستان کی محبت کو دل میں رکھنے کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے کرب کو محسوس کرنا ان کا امتیازی وصف ہے۔ "ادب میں ارضیت" ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مضمون ہے جس کا ایک پیراگراف عابد میر نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔ اس پیراگراف کو پڑھنے کے بعد میر گل خان نصیرؔ کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ میر گل خان نصیرؔ نے ایسا کلام ترتیب دیا ہیں جس میں مقامیت اور آفاقیت دوبدو چل رہے ہیں:

"آفاقیت کا عنصر ساری دنیا کے ادب میں مشترک ہے، مگر اسی دنیا کے ہر خطے کا ادب اپنی خوشبو اور انفرادیت، اپنے لمس اور لہجے کے باعث، دوسرے خطوں کی ادبیات سے مختلف ہے۔۔۔۔ گویا اس کی اپنی ایک 'شخصیت' ہے، جس کی تعمیر میں اُس خطہء ارضی کے نمک، پانی اور ہوا، ثقافتی اور تمدنی سرمایے، مذہبی اثاثے، نظریہء حیات اور خون کی حدت و خنکی، ان سب نے حصہ لیا ہے۔"(۶)

تشبیہات:

صنعت تشبیہ کا استعمال شاعری کے حسن کو چار چند لگا دیتا ہے۔ اس سے شعر کی جمالیاتی حسن میں اضافے کے ساتھ ساتھ کلام میں لذت پیدا ہوتی ہے۔ میر گل خان نصیرؔ نے اپنے کلام میں تشبیہات کا کثیر تعداد میں اور بخوبی استعمال کیا ہیں۔ انھوں نے موقع محل کے اعتبار سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تشبیہات کو کلام کا حصہ بنایا ہیں۔ چند مثالیں کلام سے ملاحظہ ہوں:

نرگسی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے رنگین آنسو

یہ مصرع "اے میرے پیارے وطن" کا ہے۔ شعر میں آنکھوں کو نرگس سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ میر گل خان نصیرؔ کسی واردات قلبی کے شکار بھی نہیں ہوئے تھے لیکن ان کی محبوب زمین پر بسنے والے لوگوں سے ہی انھیں محبت دی

تھی۔ وہ جب ان کے بارے مین بات کرتے تھے تب وہ اپنی شاعری میں اپنی محبت کا اظہار الفاظ کے الفاظ چناؤ اور تشبیہات کے استعمال سے ہی کرتے تھے۔ نرگسی آنکھوں کی اصطلاح اور تشبیہ یہاں وطن کے نازنینوں کی آنکھوں کے لیے استعمال ہوئی ہے:

مہاں ایک شب کا ہوں میں شمع کی طرح
دنیا میں ایک ہستیِ ناپائیدار ہوں

یہ شعر ان کی ایک غزل کا ہے۔ اس شعر میں میر گل خان نصیرؔ خود کو شمع سے تشبیہ دیتے ہیں اور ہستی ناپائیدار کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ ان کی شخصیت کے لیے بہت ہی موزوں ہے۔ میر گل خان نصیرؔ کی ذات بلوچ قوم کی رہنمائی میں شمع کی روشنی کی حیثیت رکھتی تھی لیکن جس طرح سے میر گل خان نصیرؔ نے بھی اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے اور خود کو قوم کے بہتر مستقبل کے لیے قربان کرکے آنے والی نسلوں کی جنگ لڑتے رہیں۔ ہستی ناپائیدار کی ترکیب نے شعر کو معنی خیز بنایا ہے۔

اس اُجڑے گلستان کو آباد کرنے

نظم "ندائے ملت" کے اس مصرعے میں وطن کو گلستان سے تشبیہ دے کر شاعر نے وطن سے محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ ایک روایتی تشبیہ کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ وطن کی بربادی کو اجڑے ہوئے گلشن سے تشبیہ دے کر میر گل خان نصیرؔ نے بلوچستان کی سرزمین کی اہمیت اور اس کی حالت زار کو بیان کیا ہیں۔ وہ زمین جس کی رعنائیاں ایک گلشن کی طرح ہیں جو خوب صورتی میں کسی بھی طرح سے ایک آباد گلشن سے کم نہیں لیکن افسوس کہ اب اس خطہ زمین کی حالت ایک ایسے گلشن کی طرح ہے جس کو اجاڑا ہے۔

زندگی بوجھ ہے جو مجھ سے اٹھائے نہ اٹھے

یہ مصرع "اے میرے پیارے وطن" کا ہے جس میں زندگی کے آلام و مصائب کو دیکھتے ہوئے میر گل خان نصیرؔ نے اسے ایک بوجھ سے تشبیہ دی ہیں۔ زندگی کے لیے شعرا کے ہاں مختلف تشبیہات کا استعمال ہوئے ہیں لیکن زندگی کو ایک ایسا بوجھ قرار دینا جس کو اٹھانا مشکل ہے جس کو سنبھالنا آسان نہیں جس کے بار گراں کو ڈھونڈنے کی سکت و طاقت بھی نہ ہوں یہ تشبیہ میر گل خان نصیرؔ کا وصف ہے۔

استعارات اور علامات:

استعارات اور علامات شاعری کے فن پر گرفت کی ایک دلیل ہے۔ محض ایک ہی چھپی ہوئی بات سے ہی شاعر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی سب کچھ میر گل خان نصیرؔ نے بھی کیا ہے۔ ان کے ہاں استعاروں کا استعمال روانی کے ساتھ ہے۔ اشعار میں کہیں پر ایک تو کہیں ایک ہی شعر میں مختلف استعارے استعمال کرکے انھوں نے

علم بیان کے اس صنف سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہیں۔ استعاروں سے مزین چند شعری مثالیں:

قسم اس غازی باطل شکن کے جذبہ و غیرت کی

میر محراب خان کے لیے اس مصرعے میں میر گل خان نصیرؔ نے "غازی باطل شکن" کا استعارہ استعمال کیا ہیں۔ یہ شعر ان کی نظم "حلف نامہ آزادی" میں شامل ہے۔ محمود غزنوی کو بت شکن اور باطل شکن کہا جاتا ہیں اور میر گل خان نصیرؔ محراب خان کو بھی ان کی طرح باطل شکن کہتے ہیں۔ جس نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے لڑنے کو ترجیح دیں۔

تمھارے وعدوں کو یاد کر کے جگر کی شمعیں جلا رہا ہوں
وہ طلب میں خراب ہو کر میں دل کی بتی جلا رہا ہوں

"جیونی بندر" نظم کے اس شعر میں جگر کے لیے میر گل خان نصیرؔ نے شمع اور دل کے لیے بتی کا استعارہ استعمال کیا ہیں۔ دل اور جگر کا استعمال شعر میں کمال حسن پیدا کرتا ہے اور پھر انہی کی نسبت سے شمعیں اور بتی دونوں کے اندر تعلق اور قربت کا پتہ دیتی ہے۔

نہ دیکھا میں نے تھا پہلے وطن کا تاجدار ایسا
سخی ایسا، دلیر و ثانیِ اسفند یار ایسا

اس ایک ہی بند میں مختلف استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ بند نظم "شہادت میر محراب خان" کا ہے۔ اس میں میر محراب خان کے لیے تاج دار، ثانی اسفندیار کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہیں پر ہی میر گل خان نصیرؔ اکتفا نہیں کرتے بلکہ آخری دو مصرعوں میں سکندر، خسرو دارا، تابِ ملت دار اور شہریار کے استعارے بھی استعمال کیے۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میر گل خان نصیر کے کلام میں استعاروں کا نظام کافی مضبوط ہے۔

تراکیب اور مرکبات:

میر گل خان نصیرؔ کی کلام کی خوبصورتی میں تراکیب اور مرکبات کا بھی اہم کردار ہیں جن کو انھوں نے بکثرت استعمال کیا ہیں۔ ان میں سے کچھ تراکیب وہ ہیں جو اقبال اور فیضؔ کے ہاں بی موجود ہیں اگرچہ ان تراکیب میں براہ راست تعلق نہ ہوں لیکن معنی کے اعتبار سے ان کے تراکیب اور مرکبات فیضؔ کے ہاں استعمال ہونے والے تراکیب اور مرکبات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ فارسی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے اور فارسی میں شعر میں بھی کہتے تھے اس لیے ان کے ہاں فارسی تراکیب بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچستان کا علاقہ جو کہ ایران کے ساتھ ہے اور سیستان بلوچستان میں رہنے والوں سے بلوچستان والوں کے ساتھ تعلقات اور رشتے بھی ہیں اس لیے فارسی تراکیب کا استعمال ان

کے کلام میں نظر آتا ہے۔ میر گل خان نصیرؔ، خان کے دربار سے بھی وابستہ رہیں اور دربار میں فارسی زبان کو اہمیت حاصل تھی۔ شاملِ کلام چند فارسی تراکیب اس طرح ہیں:

"بمثلِ جونک، بسرِ چشمِ حیات، تیغِ جوہر دار، ضونابہ ءدل، خمارے گل، شکوہ جورِ عزیزاں"

ان تراکیب کا استعمال انھوں نے بہت اعلیٰ فنکاری کے ساتھ کیا ہیں۔ عابد میرؔ نے ان کے کلام میں ۲۴۲ تراکیب کی غیر حتمی فہرست دی ہیں جو کہ ان کی کتاب "نصیرِ خوش کلام" میں حروف تہجی کے اعتبار سے درج ہیں۔ (۷) مختصر کلام میں اس قدر وسیع علمی ذخیرہ محفوظ کرنا یقیناً میر گل خان نصیرؔ کا ہی خاصا ہے۔ چند تراکیب ایسے بھی استعمال ہوئے ہیں کہ جن کو اشعار میں استعمال کرنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے لیکن میر گل خان نصیرؔ نے نہایت عمدگی کے ساتھ ان تراکیب کو اشعار میں سمو دیا ہے۔ یہ تراکیب کسی دوسرے بلوچ شاعر کے ہاں مفقود نظر آتے ہیں۔ ان تراکیب کی خوب صورتی کی چند مثالیں اشعار کے ساتھ ملاحظہ ہوں:

اے قتیلِ عشوۂ منصب امارت کا غلام
ایسے غداروں سے میر لاکھ توبہ، صد سلام
اور وہ جاگیر داروں چونک خو
چوستا ہے جو کسانوں کا لہو
یہ اسپید عمامہء برف طلعت
جو ہے کوہ ماران و چلتن کے سر پر
تعمیرِ جہانِ نو کے لیے نقش کہن برباد کرو
آموزشِ آدم نو کے لیے اک تازہ جہاں آباد کرو

چند مرکبات

۱۔ سنجاب و سمور ۲۔ شجاع و شہسوار ۳۔ عمارات و قصور ۴۔ عیش و طرب
۵۔ رنج و محن ۶۔ مُرغ و ماہی ۷۔ ناموس غیرت ۸۔ نشاط و عیش
۹۔ قوس و قزاح ۱۰۔ لیل و نہار

ہندی لفظیات:

ہندی زبان کے بیشتر الفاظ میر گل خان نصیرؔ کے کلام میں ملتے ہیں۔ عابد میر نے ان کے کلام سے ہندی کے ۴۹ لفظیات تلاش کر کے اپنی کتاب "نصیرِ خوش کلام" میں درج کیا ہے۔ یہ اُن کے کلام میں ایک نئی بات ہے۔ ہندی الفاظ

ان کے اس وقت کے ہم عصروں کے ہاں اس قدر کثرت سے نہیں دکھائی دیتے۔ یہ الفاظ میر گل خان نصیرؔ کے قاری کے لیے انجان بھی ہیں۔ بیشتر نظموں میں ہندی الفاظ کا استعمال اس طرح سے ہے کہ نظم ہندی گیت کے قریب قریب معلوم ہوتی ہے۔ ان کی ایک نظم "راج کرے سردار" میں ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ اس نظم سے دو بند ملاحظہ ہوں:

بلک بلک کر بچے روئیں
بھوکے پیٹ سجنوا سوئیں
سجنی گھر کی لاج ڈبوئیں
توند بھرے زردار ۔۔۔رے بھیا
راج کرے سردار
پاک وطن کی ریت نیاری
بھوکی، ننگی جنتا ساری
سن کر جھومیں دھن کے پجاری
روپوں کی جھنکار ۔۔۔رے بھیا
راج کرے سردار

ہندی کے مزید الفاظ بطور مثال:

۱۔ بُدھی	۲۔ اَنیائے	۳۔ پالن ہار	۴۔ بھکشا	۵۔ اَن داتا
۶۔ رکشک	۷۔ دُشٹ	۸۔ ماتر بھومی	۹۔ مورکھ	۱۰۔ نربودہ
۱۱۔ دیر	۱۲۔ دیش	۱۳۔ جے کار		

تلمیحات:

تلمیح شاعری کی ایسی صنعت ہے جس سے محض ایک لفظ یا الفاظ کے مجموعے کے ذریعے کسی تاریخی، سیاسی یا مذہبی واقعے کی طرف شعر کے اندر اشارہ کیا جاتا ہے جس سے وہ واقعہ یا تاریخ مکمل طور پر عیاں ہوتی ہے۔ تلمیحات نثر میں ہو یا نظم میں ان معنی خیز اشاروں سے ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات میں بلاغت کا روح پھونکتے ہیں۔ تلمیح سے کلام بامعنی ہوتا ہے اور فصاحت و بلاغت کا وصف بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے مختصر الفاظ اور انداز میں بہت بڑی بڑی باتیں بتادی جاتی ہیں اور ان حقائق کو سمو دیا جاتا ہیں جن کو بتانے کے لیے کئی کئی صفحوں کی ضرورت پڑتی ہے نیز اس سے شاعر اور فنکار کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے شعر کے معنوں میں وُسعت اور حسن پیدا ہوتا ہے، مفاہیم

واضح ہوتے ہیں اور کلام میں زور اور اثر انگیزی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کے انداز بھی بہت سی تلمیحات کا استعمال ہوا ہے۔ عربی، فارسی اور برصغیر کی زبانوں میں اس کا استعمال کافی عام ہے اور اس کو شعری زبان کا جز سمجھا جاتا ہے۔ اُردو غزل نے تلمیح کی شعری افادیت سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ اُردو کے چھوٹے بڑے تمام شعرا کے ہاں اس کا رواج ملتا ہے۔

تلمیح کا استعمال خاص فنکاری اور تجربے کا طالب ہے۔ اگر مذکورہ واقعے یا تاریخی سے صحیح معنوں میں واقفیت یا معلومات نہ ہوں تو پھر تلمیح کا استعمال شعر کے حسن کو غارت کر سکتا ہے۔ میر گل خان نصیرؔ نے مختلف جگہوں پر تلمیح سے کام لیا ہیں۔ اس صنعت کا استعمال علم بیان پر ان کی گرفت کا ثبوت ہے۔ اگرچہ انھوں نے تلمیحات کا استعمال کچھ زیادہ نہیں کیا ہیں لیکن اس مختصر اُردو کلام میں انھوں نے جہاں جہاں موقع ملا تلمیحات استعمال کیے ہیں۔ وہ خود مؤرخ تھے اس لیے اپنی تاریخی شعور کا ثبوت انھوں نے تلمیحات کے استعمال کے ذریعے دیئے ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ کے تلمیح کی ایک جہت جو شخصی تلمیح کہلاتی ہے اس کا استعمال ہوا ہے۔ کلام میں شامل چند تلمیحات کا اشعار میں استعمال اور پس منظر کچھ اس طرح ہیں:

سکندر، خسرو دارا، تابِ ملت دوستدار ایسا
سخی مال و یتیم پرور، خدا ترس شہر یار ایسا

مندرجہ بالا شعر نظم ''شہادت میر محراب خان'' سے لیا گیا ہے۔ اس شعر میں ''خسرو و دارا، سکندر و شہریار'' کی تلمیحات استعمال ہوئیں ہیں۔ ایک ہی شعر میں تلمیحات کو خوب صورتی کے ساتھ پرونا فنکاری کی اعلیٰ مثال ہے۔ ان تلمیحات کو میر گل خان نصیرؔ نے میر محراب خان کے لیے استعمال کیا ہیں جس کی ذات میں وہ ایرانی سلطنت کے گزرے ہوئے بادشاہوں کی خصوصیات دیکھتے ہیں۔ ان بادشاہوں میں خسرو پرویز، دارایوشِ اعظم اور شہر یار قدیم ایرانی سلطنت کے بادشاہر ہے ہیں۔ ان بادشاہوں کا عدل و انصاف مشہور تھا۔

آخری تلمیح سکندر اعظم کی ہے۔ جس کو 'الیگزنڈر دی گریٹ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سکندر اعظم نے آدھی دنیا پر اپنی فتوحات کا دائرہ پھیلایا تھا اور اپنی بہادری میں کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یونان کی شہری ریاستوں کے ساتھ مصر اور فارس تک فتح پائی۔ صرف بائیس سال کی عمر میں وہ دنیا فتح کرنے کے لیے نکلا۔ ان سے خانِ اعظم کو تشبیہ دیا گیا ہے۔

نہ خوف کر نہ باک کر
لگا نشانہ تاک کر
یہ لات کو منات کو
بتانِ سومنات کو

یہ اشعار نظم 'اٹھ اے بلوچ' کے ایک بند کے ہیں۔ پہلی تلمیح کا پسِ منظر کچھ اس طرح ہے کہ لات طلوع اسلام سے قبل عرب کے ایک مشہور بت کا نام تھا جو طائف میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مربع شکل میں سفید پتھر سے بنا ہوا تھا اور اہلِ عرب اس کو خدائی کا درجہ دیتے تھے۔ یہ بت طائف میں رکھا ہوا تھا اور وہیں اس کی عبادت ہوتی تھی۔ یہ ایک دیوی تھی اور عرب کے تین قبل از اسلام دیویوں کا حصہ تھی جن کا مجموعہ لات، منات اور عزٰی کہلاتا تھا۔

تلمیح کا دوسرا حصہ ''منات'' کے نام سے ہے۔ لات کی طرح یہ بھی عربوں کی زمانہ جاہلیت کی دیویوں میں سے ایک تھی۔ اس کو اللہ کی بیٹی کہہ کر اس کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس کا مندر بحر احمر کے کنارے مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک آبادی قدید کے مقام پر تھا۔ یثرب کے اوس خزرج کے علاوہ بنو خراعہ بھی اس کے معتقد تھے اور کعبہ کی طرح اس کا حج بھی کرتے تھے اور قربانی کے جانور بھی اس کے لیے ذبح کیے جاتے تھے۔ اسلام کے نور کے ساتھ ہی ان تمام بتوں کو پاش پاش کیا گیا اور ان کی باطل خدائی ختم کی گئی۔

دوسری تلمیح 'بتانِ سومنات' دراصل ہندوستان کے شہر سومنات کے مندروں کی طرف اشارہ ہے۔ سومنات ہندوستان کا ایک اہم علاقہ ہے جسے محمود غزنوی نے مسلسل سترہ حملوں کے بعد ۱۰۲۶ء میں فتح کر کے یہاں اسلام کی پہلی اینٹ رکھی تھی۔ ہندوؤں کے اس مذہبی علاقے کو فتح کرنے بعد انھوں نے سومنات کے مشہور مندر میں رکھے ہوئے بڑے بڑے بتوں کو توڑ دیا۔ ان بتوں کو ڈھانے پر محمود غزنوی کو بت شکن کا لقب بھی دیا جاتا ہے۔

ان اشعار میں ''لات و منات، بتانِ سومنات'' کی تلمیحات استعمال ہوئی ہیں۔ سردار، سرمایہ دار اور استحصالی طبقے کو لات و منات اور سومنات کے بتوں سے تشبیہ دی گئی ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ ان فرضی خداؤں کو مٹانے کے لیے بلوچ نوجوانوں کو ان بت شکنوں کی تاریخ سنا کر ہمت دلاتے ہیں۔

بلال و خالد و فاروق سا ایمان تھا اس کا
خدا کا آسرا تھا اور یہی سامان تھا اس کا

یہ شعر نظم ''یاد اسلم'' سے لیا گیا ہے۔ شعر میں تین اصحاب کرام کے نام بطور تلمیح استعمال ہوئے ہیں۔ پہلا نام حضرت بلالؓ کا ہے۔ حضرت بلالؓ کا عشق اور صبر مشور تھا۔ آپ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے۔ آپ کو اعلانیہ اسلام پر طرح طرح کے مظالم اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تپتی ہوئی ریت، جلتی ہوئی سنگریزوں اور دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹائے گئے، مشرکین مکہ کے اوباش لڑکوں نے گلے مبارک میں رسی ڈال کر کھینچا، سینے پر پتھر رکھے گئے لیکن آپ کے ایمان اور صبر و استقلال میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔ دوسری تلمیح حضرت خالد بن ولیدؓ کی ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اسلام کے عظیم سپہ سالاروں میں سے تھے۔ ۵۲۱ کے قریب جنگوں میں حصہ لیا اور ہمیشہ فتح سے ہمکنار رہے۔ جنگ موتہ میں بے مثال شجاعت اور بہادری دکھانے پر حضور ﷺ نے انھیں سیف اللہ یعنی اللہ کی تلوار کا خطاب دیا۔ تیسری تلمیح حضرت

عمر فاروقؓ کی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ اور اسلام کی عظیم شخصیات میں سے ہیں۔ آپؓ باعظمت اور عادل حکمران کے طور پر مشہور ہیں۔ آپ کے ایمان کی پختگی اور ترویج اسلام کے لیے کوششیں بھی معروف ہیں۔ میر گل خان نصیرؔ آپنے رفیق اسلم کے ایمان کو ان ہستیوں کے ایمان کی طرح قرار دیتے ہیں۔

کیسے مانوں کہ یہاں ختم رعونت ہو گی
جب کہ ہے نعرۂ لادینی و مستانہ وہی

نظم "کیسے مانوں" کے اس شعر میں فرعون کی تلمیح استعمال کی گئی ہے۔ فرعون شاہان مصر کا لقب تھا۔ مصر کے بادشاہوں کو فرعون کہتے تھے۔ فرعون موسیٰ کا ذکر قرآن پاک میں سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ فرعون کا تکبر تاریخ اور ادب میں مشہور ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے انھیں دعوت حق دیں اور اپنی رسالت کی نشانیاں بھی دکھائیں مگر انھوں نے ماننے سے انکار کیا جب بنی اسرائیل اللہ کے حکم سے آزاد ہوئے اور وادیٔ سینا کی طرف جانے لگے تو فرعون پانی میں ڈوب کر مر گیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو خدا کے برابر سمجھا اور اللہ نے انھیں آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔ میر گل خان نصیرؔ آپنے وطن پر قابض سرمایہ داروں کو فرعون سمجھتے ہیں اور ان کی موجودگی میں خوشحالی کا تصور نہیں کر سکتے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہ محمد مری، (پیش لفظ) کارواں کے ساتھ، مشمولہ: گل خان نصیر، کوئٹہ: میر گل خان نصیرؔ چیئر، یونیورسٹی آف بلوچستان، ۲۰۱۵ء)، ص:۱۳

۲۔ واحد بخش بزدار، میر گل خان نصیر، شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص:۳۴۔۳۵

۳۔ آغا محمد ناصر، بلوچستان میں اُردو شاعری، مقام ندارد، ۲۰۰۰ء، ص:۹۸

۴۔ عابد میر، نصیر خوش کلام، کوئٹہ: میر گل خان نصیرؔ چیئر، یونیورسٹی آف بلوچستان، ۲۰۱۵ء، ص:۲۱

۵۔ بحوالہ: شیخ نور (مرتب)، میر گُل خاں نصیر، شخصیت، شاعری اور سیاست، کراچی: عوامی ادبی انجمن، ۱۹۹۳ء، ص:۶۷

۶۔ عابد میر، نصیر خوش کلام، ص:۶۲

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً